ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

جنوری ۲۰۱۹

www.inzaar.pk

January 2019

اہل مذہب کی کمزوریوں کو دیکھ کر
اعلیٰ انسان خدا کو دریافت کرتے ہیں

انکار خدا کا کام کمزور لوگ کیا کرتے ہیں
اور خدا کے نمائندے بن کر اٹھ جاتے ہیں

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ماہنامہ
اِنذار
جنوری 2019ء ربیع الثانی/جمادی الاول 1440ھ
جلد 7 شمارہ 1

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ،
سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی(بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی(نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

پیس آف میٹ (Piece of Meat)

انسانی تاریخ میں عورت کا ایک بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ اسے ہر دور میں پیس آف میٹ (Piece of Meat) ہی سمجھا گیا ہے۔ تہذیب قدیم ہو یا تہذیب جدید دونوں کا رویہ اس حوالے سے یکساں ہی رہا ہے کہ ان کے نزدیک عورت مزہ لینے کی ایک چیز ہی رہی۔ زمانہ قدیم میں عورتوں کو حرم کی زینت بنا کر یہ مقصد حاصل کیا گیا اور دور جدید میں انھیں میڈیا کی زینت بنا کر یہی خدمت لی جا رہی ہے۔

اس پورے معاملے میں صرف ایک ہی استثنا ہے۔ وہ استثنا دین اسلام کی تعلیمات کا ہے۔ اسلام نے نہ صرف اپنی نظری تعلیمات سے بلکہ عملی احکام سے بھی عورت کو پیس آف میٹ کے مقام سے اٹھایا اور مردوں جیسا ایک انسان بنا کر پیش کیا ہے۔

قرآن مردوں کو سکھاتا ہے کہ عورتیں، گھورنے اور تاڑنے کی چیز نہیں ہوتیں۔ عورتوں کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ نکاح کا تعلق قائم کیا جائے۔ مردوں کے حوالے سے یہی چیز عورتوں کو سکھائی گئی ہے۔ مگر اس سے آگے بڑھ کر انھیں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ وہ خود بھی مردوں کے سامنے ایک نمائش کی چیز بن کر نہ آئیں۔ اپنی جنسی کشش کو چھپائیں۔ اپنی زنیت کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ مرد کے اندر کے شیطان کو جگانے والی یہی چیزیں ہیں۔ اس معاملے میں اس حد تک احتیاط کی تلقین کی گئی ہے کہ خواتین کے پوشیدہ زیورات بھی اگر پکار کر مخاطب کو یہ احساس دلانا چاہیں کہ ان کے سامنے عورت ہے تو تلقین کی گئی ہے کہ ان کی بھی زبان بندی کر دو۔

یہی وہ احکام ہیں جن کے بعد عورت فطری حدود میں رہ کر گھر کے اندر اور باہر سارے معمولات زندگی سرانجام دے سکتی ہے، مگر وہ مردوں کے سامنے پیس آف میٹ بن کر نہیں آتی بلکہ انسان بن کر آتی ہے۔ اس پہلو سے یہ احکام انسانیت کی معراج ہیں۔

وقت کا ایورج

پاکستان اپنی ضرورت کا پٹرول درآمد کرتا ہے۔ معیشت کی زبوں حالی کی بنا پر اب یہ پٹرول بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ چنانچہ لوگ گاڑیوں کے ایورج یا اوسط پٹرول کے استعمال کے بارے میں حساس ہو گئے ہیں۔ ماضی کی گاڑیوں کے برعکس موجودہ دور کی گاڑیوں میں یہ سہولت موجود ہے کہ گاڑی اوسطاً جتنا پٹرول استعمال کر رہی ہوتی ہے، وہ ڈرائیور کو نظر آتا رہتا ہے۔

اب کسی ڈرائیور کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ گاڑی چلاتے ہوئے سامنے لگے میٹر پر یہ دیکھ سکتا ہے کہ گاڑی کا اوسط پٹرول استعمال کتنا ہے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہر لمحہ بدلتے ہوئے اس میٹر کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی کے پٹرول اوسط کو خراب کرنے والی چیز گاڑی کا ساکن کھڑا رہنا ہے۔ یہ چاہے کسی سگنل پر رکنے کی وجہ سے ہو یا پھر سڑک کے کنارے گاڑی کو اسٹارٹ حالت میں کھڑا کر کے فون وغیرہ سننے کی وجہ سے ہو۔

یہ واقعہ انسانی زندگی میں وقت کے استعمال کی بڑی اچھی مثال ہے۔ ہمیں ہر روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے 86400 سیکنڈ دیے جاتے ہیں۔ ہم جس جس لمحے کو کسی مقصد یا ضرورت میں استعمال کرتے ہیں، وہ ہمارے وقت کے اوسط استعمال کو بہتر سے بہتر بنا دیتا ہے۔

تاہم جس لمحے ہم کچھ نہیں کرتے یا اپنے وقت کو بے فائدہ کاموں میں استعمال کرتے ہیں، ہمارا اوسط خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وقت کو اس طرح ضائع کرنے والے لوگ اوسطاً پورے دن میں دو چار بامقصد اور مفید کام بھی نہیں کر پاتے۔ جبکہ اپنے ہر ہر لمحے کو کسی مفید، بامقصد اور بامعنی کام میں استعمال کرنے والے لوگ اسی ایک دن میں درجنوں مفید کام کر کے اپنے، اپنے خاندان، ادارے، سماج اور پوری انسانیت کا نجانے کتنا بھلا کرتے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہر شخص گاڑی کے ایورج کی طرح اپنے وقت کے ایورج پر بھی نظر رکھے۔

نصرت دین

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ دعوت دی ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے دین کے مددگار بن جائیں۔ پھر یہ وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا۔اس حوالے سے ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے میں مذہب کے نام پر کھڑے لوگ بارہا ایک دوسرے سے بالکل متضاد نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اور سب لوگ اپنے اپنے لیے نصرت الٰہی کے دعوے بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں وہ کیا ضابطہ ہے جس کی بنیاد پر یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ کس شخص یا گروہ کو نصرت الٰہی مل رہی ہے اور کون ہے جسے اپنی گمراہیوں کو پھیلانے کے لیے ڈھیل دی جارہی ہے۔

اس سوال کا جواب قرآن مجید اس طرح دیتا ہے کہ اس نے جس جگہ نصرت دین کے لیے اٹھنے کی دعوت دی ہے وہاں اس کے مخاطب وہ صحابہ کرام ہیں جو اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھ کر ایمان لائے تھے۔ وہ اپنے کسی فرقے، آبائی مذہب یا تعصب کے اسیر نہ تھے۔حق ان کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ چنانچہ نصرت دین کے حکم کے مخاطب ہی وہی لوگ تھے اور نصرت الٰہی کا ضابطہ بھی ان کے لیے ہی تھا۔

یہی وہ معیار ہے جس پر آج یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کا کون سا گروہ ہے جو نصرت الٰہی کا حقدار ہے اور کون ہے جسے ڈھیل دی جارہی ہے۔ نصرت الٰہی کے حقدار وہی لوگ ہیں جن کے لیے حق سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جو حق کو اپنی ذات، فرقہ اور اپنے عالم کے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اپنے ہر تعصب سے اوپر اٹھ کر سچائی کو تلاش کرتے ہیں۔ کوئی غلطی واضح کرے تو جواب دینے کی نفسیات کے بجائے خود پر تنقید کو سنتے اور اصلاح کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں نصرت الٰہی کے حقدار اور آخرت میں خدا کی رحمت کے مستحق ہوں گے۔

هَل لَّكَ إِلَى أَن تَزَكَّى

قرآن مجید کی آخری سورتیں اپنے مضامین کے لحاظ سے بڑی جامع لیکن طوالت میں بہت چھوٹی ہیں۔ ان میں بعض بڑے بڑے تفصیلی مضامین بہت اختصار کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ بڑی تفصیل کے ساتھ کئی مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مگر یہی قصہ حضرت موسیٰ کی نبوت سے لے کر فرعون پر عذاب تک صرف دس آیات میں سورہ نازعات (79) میں بیان کر دیا گیا ہے۔

اس مقام پر حضرت موسیٰ کی دعوت کو قرآن دو جملوں میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَى أَن تَزَكَّى **(18)** وَأَهْدِيَكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَخْشَى **(19)**

مطلب کہ فرعون سے پوچھو کہ تجھ میں خواہش ہے کہ تو پاکیزہ بنے۔ میں تجھے تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں کہ تو اس سے ڈرے۔

قرآن مجید نے یہاں بڑے کمال کے ساتھ نہ صرف حضرت موسیٰ بلکہ درحقیقت تمام انبیا کی دعوت کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ دین کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اس مادی دنیا اور اپنے حیوانی وجود سے جنم لینے والی اخلاقی آلائشوں سے خود کو بچا کر ایک پاکیزہ زندگی گزارے۔ انبیا کی دعوت کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ پھر اس مقصد کے لیے وہ لوگوں کو اپنے رب عظیم کا راستہ دکھا کر ان میں خدا خوفی پیدا کرتے ہیں۔ یہی خدا خوفی انھیں ہر اخلاقی نجاست سے بچاتی ہے۔ چاہے ان کا نفس، شیطان، دنیوی ترغیبات اور حالات کا دباؤ کتنا ہی ان کو برائی کی طرف بلانے والا ہو۔

یہی پاکیزگی نفس جنت کی فلاح کی ضامن ہے۔ یہی خوف خدا ہر برائی سے انسان کو بچاتا ہے۔ چنانچہ جب بھی ہم میں سے کوئی شخص سیدھی راہ سے ڈگمگائے اسے یہ پیغمبرانہ سوال خود سے کرنا چاہیے۔ هَل لَّكَ إِلَى أَن تَزَكَّى ؟ یہ سوال اسے ہمیشہ راہ راست پر رکھے گا۔

حالات کی ضرب

''سر میں بہت سے مسائل کا شکار ہوں۔ عرصے سے روزگار نہیں مل رہا۔ گھریلو حالات خراب ہیں۔ بہنوں کی شادی میں بھی مشکلات درپیش ہیں اور اپنی شادی کا تو بے روزگاری کی وجہ سے کوئی امکان ہی نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟''

یہ ایک نوجوان تھا جو عارف کی مجلس میں کسی جاننے والے کے ہمراہ پہلی دفعہ آیا تھا۔ اس مجلس میں علم و حکمت کے موتی بکھرتے تھے۔ اس نوجوان کے مسائل سن کر ہی عارف کی مجلس میں باقاعدہ آنے والے ایک صاحب اس نوجوان کو ساتھ لے آئے تھے کہ اس کی کچھ رہنمائی ہو سکے۔

''کبھی کسی خوبصورت مجسمے کو دیکھا ہے؟''، عارف نے ایک سوال سے اپنے جواب کا آغاز کیا۔ نوجوان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ عارف نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اور کسی انگوٹھی میں جڑے ہیرے یا کسی قیمتی پتھر کو بھی دیکھا ہوگا؟''، نوجوان کا جواب پھر اثبات میں تھا، گرچہ لگتا تھا کہ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ عارف مسکرائے اور بولے۔

''یاد رکھیے! کوئی خوبصورت مجسمہ، کوئی خوبصورت ہیرا اور کوئی خوبصورت نگینہ وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کوئی ماہر اسے ضرب نہ لگائے، اسے چوٹ نہ مارے اور اسے کاٹ کر اور گھس کر ہموار نہ کرے۔''

نوجوان کے چہرے پر ابھی بھی نہ سمجھنے والے تاثرات تھے۔ عارف نے سمجھانا شروع کیا:

''مشکل حالات اسی لیے آتے ہیں۔ یہ ہمیں کاٹتے ہیں، گھستے ہیں، ہمیں ضرب لگاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہماری شخصیت کو تراش کر ایک خوبصورت ہستی بنانا ہوتا ہے۔ ہمیں ایک قیمتی ہیرا بنانا ہوتا ہے۔ مگر ہم خدا کے اس کام کو سمجھنے کے بجائے اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔''

''مگر میری شخصیت میں تو کوئی خوبصورتی نہیں آ رہی۔ میرا تو مزاج ہی ان حالات کی وجہ سے بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ میں چڑچڑا ہو رہا ہوں۔ ہر وقت غصہ آتا رہتا ہے۔''

نوجوان کی سمجھ میں بات تو آ گئی تھی، مگر اس کا مسئلہ بدستور باقی تھا جو اس نے عارف کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے دلنشین لہجے میں دوبارہ کہا:

''اس کا سبب آپ کی مزاحمت ہے۔ آپ حالات کی ہر ضرب پر مزاحمت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی پتھر کسی سنگتراش کی ہتھوڑی لگنے پر مزاحمت شروع کر دے۔ پتھر مزاحمت نہیں کرتے۔ اس لیے وہ پتھر سے شاہکار بن جاتے ہیں۔''

''مگر میں تو پتھر نہیں۔ مجھے درد ہوتا ہے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔'' نوجوان بحث پر آمادہ تھا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ درد محسوس کرنا بند کر دیں۔ درد تو ہوگا، تکلیف بھی ہوگی۔ مگر آپ اس درد کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیں، صبر کرنے کا فیصلہ کر لیں تو یہ درد دو کام کرے گا۔''

یہ کہہ کر عارف رکے اور نوجوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''پہلا یہ کہ یہ آپ کی شخصیت کو بہت مضبوط بنا دے گا۔ درد انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مشکل سے ہر انسان گھبراتا ہے۔ مگر جو شخص ان کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے، وہ ناقابل شکست ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر امتحان میں سرخرو ہوتا ہے۔ اسے ہر دوڑ میں فتح اور ہر مقابلے میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ درد برداشت کرنے کا بدلہ حوصلہ ہے اور حوصلہ ہر کامیابی کی کنجی ہے۔''

اس آخری جملے پر حاضرین مجلس جھوم اٹھے۔ نوجوان کو ساتھ لانے والے صاحب بے اختیار بولے۔

''واہ! آج تو درد کا سارا فلسفہ سمجھ میں آ گیا''، عارف کا رخ نوجوان کی طرف رہا۔

''اس درد کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہی درد انسان کو عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ درد انسان میں توانائی پیدا کرتا ہے۔ ہم کرتے یہ ہیں کہ اس توانائی کو غصہ اور جھنجھلاہٹ میں ضائع کر دیتے ہیں۔اس کے بجائے اس توانائی سے عقل کو بیدار کرنا چاہیے۔ عقل بیدار ہوگی تو آپ کے مسائل کا کوئی نہ کوئی حل نکال دے گی۔ آپ حل نہ بھی نکال سکے تو وقت گزرنے پر حالات خود ہی کوئی راستہ کھول دیتے ہیں۔ مگر اس عرصے میں آپ کی شخصیت مضبوط اور توانا ہو جاتی ہے۔ آپ کا حوصلہ بلند اور عقل فعال ہو جاتی ہے۔ یہی دو چیزیں انسانی شخصیت کو سارا جمال اور ساری توانائی دیتی ہیں۔ یہی چیزیں آپ کو دوسروں کی نگاہوں میں بہت دلکش بنا دیتی ہیں۔ درد کو برداشت اور استعمال کرنا آپ کے وجود کو ایک پیکرِ تراشیدہ بنا دیتا ہے۔''

نوجوان کے چہرے پر پہلی دفعہ مثبت تاثرات ابھرے۔ بات اب اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ مگر اس کو ساتھ لانے والے صاحب بولے۔

''جناب آپ کی بات درست ہے، مگر یہ بہت مشکل راستہ ہے۔ کوئی آسان راستہ بھی ہے پیکرِ تراشیدہ بننے کا۔''

''ہاں......آسان راستہ بھی ہے۔''، عارف نے شگفتگی کے ساتھ کہا:

''کسی اچھے استاد، کسی اچھے عالم، کسی اچھے مربی کی صحبت اختیار کیجیے۔ اس کی تنقید کو کھلے دل کے ساتھ سنیے۔ اچھا مربی شخصیت ساز ہوتا ہے۔ وہ اپنی تنقید سے آپ کی ناپختہ شخصیت کو تراشیدہ ہیرے میں بدل دے گا۔ مگر آپ کو اس کی بات سننی ہوگی۔ اس کی بات ماننی ہوگی۔ اور اپنے اوپر کی گئی تنقید کو حوصلے کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا۔ یہی آسان راستہ ہے۔''

عارف کی بات پوری ہوئی تو نوجوان نے آہستگی سے کہا:

''میں یہاں آتا رہوں گا۔ یہ آسان راستہ ہے۔''

پاکستان: حال اور مستقبل

پاکستان کے حالات پر گہری نظر رکھنے والے یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ پاکستان اس وقت امکانات ومشکلات کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جس میں سے ایک راستہ مکمل تباہی کی طرف اور دوسرا راستہ عظمت اور سربلندی کی طرف جاتا ہے۔

ہمارے امکانات یہ ہیں کہ پاکستان میں ایک ایسی قیادت موجود ہے جس کی حمایت ملک کے چاروں صوبوں میں یکساں ہے اور جسے اسٹیبلشمنٹ کی بھی مکمل حمایت حاصل ہے۔ ملک کا وزیراعظم وہ شخص ہے جس کی شہرت ہر مشکل میں آخر کار کامیاب ہونے کی ہے اور جس کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ سیاست اس کے لیے دولت بڑھانے کا ذریعہ نہیں بلکہ عوام کی بہتری کا ایک مشن ہے۔

پاکستان سی پیک جیسے منصوبے کا اہم حصہ ہے جو اس وقت تو ملکی خزانے پر بوجھ اور قرض بڑھانے کا سبب ہے، لیکن مستقبل کی بہتری کے بہت سارے امکانات اپنے اندر رکھتا ہے۔اس کے ساتھ ملک کی زراعت، صنعت، سیاحت وغیرہ میں ایسے امکانات پوشیدہ ہیں کہ ایک باشعور سیاسی قیادت کے پاس اگر بصیرت، یکسوئی اور سیاسی استحکام ہو تو وہ کچھ ہی عرصے میں ملک کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتی ہے۔ یہ سارے امکانات اپنی جگہ مگر اس دوراہے کی دوسری راہ کے حقائق بڑے تلخ ہیں۔ان پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔

پاکستان کئی اطراف سے دشمنوں میں گھرا ہے۔ بھارت، افغانستان، ایران اور سپر پاور امریکہ،کوئی بھی پاکستان کا خیر خواہ نہیں۔دوسری طرف پاکستان کی معیشت تباہی کے دہانے پر ہے۔ یہی وہ معاشی کمزوری ہے جس نے تین دہائیوں قبل ایک سپر پاور سوویت یونین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔حالانکہ اس کے اسلحہ خانے میں اتنے ایٹم بم اور اتنی فوج تھی جس کا عشر عشیر بھی

ہمارے پاس نہیں ہے۔ان سب کے ساتھ یہ خوفناک حقیقت منہ کھولے کھڑی ہے کہ سول ملٹری تعلقات کی تلخی کی گونج اب سوشل میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچ چکی ہے۔

پاکستان کا سوشل فیبرک بالکل بوسیدہ ہوکر تارتار ہورہا ہے۔ایک طرف کرپشن ہے اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کرپشن کے خلاف ہیں، مگر خود تہذیب و اخلاق کو پامال کرنا اپنا معمول بنائے ہوئے ہیں۔ایک طرف وہ سیاسی قیادت ہے جو لوٹ مار کو اپنا حق سمجھتی ہے اور دوسری طرف وہ سیاسی قیادت ہے جو بصیرت سے عاری اور الزام تراشی کو ہر قومی مسئلے کا حل سمجھتی ہے۔ایک طرف رٹے اور نقل پر مبنی نظام تعلیم اور اس سے جنم لینے والی سطحیت پسند نسل ہے اور دوسری طرف فرقہ واریت، انتہا پسندی، تقلید اور جمود زدہ مذہبی طبقہ ہے۔

عروج اور تباہی کے اس سنگم پر ہم گویا معلق کھڑے ہیں۔لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری قیادت ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔ یہ غلط فہمی ہے۔ یہ خدا کی دنیا ہے۔ فیصلے وہی کرتا ہے۔مگر اس کے فیصلے الل ٹپ نہیں ہوتے۔ ایک مسلمان قوم کے بارے میں اس کے فیصلوں کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ایمان و اخلاق کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے۔قوم اگر متعصب، انتہا پسند، فرقہ وارانہ اور اخلاقی حس سے محروم لیڈرشپ کے پیچھے چلتی ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی لیڈر ہمیں مکمل تباہی سے نہیں بچا سکتا۔

لیکن اگر قوم یہ طے کر لیتی ہے کہ اسے خدا کی پکار پر لبیک کہنا ہے۔تعصّبات کے بجائے سچے ایمان، فرقہ واریت کے بجائے اخلاقیات، انتہا پسندی کے بجائے معقولیت کو اختیار کرنا ہے تو پھر مبارک ہو۔قوم کے اچھے دن آرہے ہیں۔ پھر ہمارا مستقبل محفوظ ہے۔ پاکستان دنیا کی ایک عظیم قوم بنے گا۔یہی اس قوم کے بارے میں ہماری دعا ہے اور یہی امید ہے۔مگر قوم جان لے کہ فیصلہ اس نے کرنا ہے، کسی اور نے نہیں۔

جنت کا مسافر

مرزا رجب علی بیگ سرور (1786-1867) اردو زبان کے ابتدائی اور ممتاز ترین نثر نگاروں میں سے ایک ہیں۔ان کی کتاب فسانہ عجائب اپنے وقت کی مشہور ترین داستان تھی۔ یہ داستان اس قدیم اردو کا بہترین نمونہ تھی جو فارسی اور عربی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کتاب میں وہ جگہ جگہ قافیے کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً وہ سفر کی مشقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سفر اور سقر (جہنم) کی صورت ایک ہے اور ان سے بچنا نیک ہے۔

انداز بیان کی خوبصورتی سے قطع نظر یہ بات اپنے اندر بڑی حقیقت لیے ہوئے ہے کہ سفر ایک انتہائی مشقت والا کام ہے۔ دورِ قدیم کو تو چھوڑیے جب شہروں کا سفر دنوں اور ملکوں کا مہینوں سے کم نہیں ہوتا تھا، آج کی تیز رفتار اور باسہولت سواریوں کے باوجود بھی سفر کرنا مشقت سے خالی نہیں ہے۔اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک لوگ بڑی تعداد میں سفر کرتے رہے ہیں اور زمین کے ہر خشک و تر کے بعد اب انسان خلاؤں میں محوِ سفر ہے۔اس اعتبار سے انسان ایک کامیاب مسافر ہے۔

انسان کی اس کامیابی کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک مسافر کے طور پر بھیجا گیا ہے۔اس کی منزل جنت ہے جس کے لیے اسے دنیا کے دارالامتحان سے گزرنا ضروری ہے۔اس طرح سفر اس کی سرشت میں شامل ہے۔مگر افسوس کہ انسان اس دنیا میں آکر اپنی اصل منزل کھو چکا ہے۔اور منزل کے کھو جانے کے بعد وہ دربدر بھٹکتا پھرتا ہے اور اپنے سفر کو حاصل حیات سمجھتا ہے جبکہ دراصل یہ زندگی کا زیاں ہے۔

ایسے میں یہ قرآن مجید ہے جو بھٹکے ہوئے راہی کو اس کی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ یہ دنیا اس ابدی مسافر کا عارضی پڑاؤ ہے۔انسان کی منزل جنت کی وہ بستی ہے جس میں

انسان ہمیشہ زندہ رہے گا۔اس کے ساتھ ایک مسافر کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے جن دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، قرآن ان سے بھی انسان کو پوری طرح متعارف کراتا ہے۔ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ انسان کو اپنی منزل کا راستہ(direction) معلوم ہو اور دوسرے اس کے پاس منزل تک پہنچنے کا مضبوط جذبہ(motivation) موجود ہو۔

قرآن یہ راستہ ایمان و اخلاق کے ان تقاضوں کی شکل میں اس کے سامنے رکھتا ہے جنھیں عرف عام میں خالق ومخلوق کے حقوق کہا جاتا ہے۔ جبکہ اس منزل کے بارے میں شکوک و شبہات دور کرنے اور اسے موٹی ویٹ کرنے کے لیے قرآن اپنا عقلی اور فطری استدلال اس کے سامنے رکھتا ہے۔اس استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن اس کائنات میں پھیلے ہوئے مشاہدات انسان کے سامنے رکھتا ہے۔زمین سے لے کر آسمان تک پھیلے یہ مشاہدات انسان کو معمولات کا حصہ لگتے ہیں۔قرآن انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ یہ معمولات نہیں بلکہ معجزات ہیں۔انسان چونکہ بچپن سے ان عجائبات کو دیکھتا ہے اس لیے ان کا غیر معمولی پن اسے محسوس نہیں ہوتا۔

انسان اپنی دوبارہ پیدائش کو عجیب بات سمجھتا ہے۔وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کبھی وہ عدم تھا اور پھر خدا نے اسے وجود دے دیا۔جس خدا نے یہ معجزہ کر دیا اس کے لیے دوبارہ معجزہ کرنا کون سا مشکل کام ہے۔انسان جنت کا انکار کرتا ہے۔خدا بتاتا ہے کہ اس نے پہلے ہی اس کرہ ارض کی شکل میں ایک جنت بنا رکھی ہے۔اس کے لیے ایک اور جنت بنانا کیا مشکل؟انسان سزا و جزا کا انکار کرتا ہے۔ قرآن رسولوں کی سرگزشت کو پیش کر کے یہ بتاتا ہے سزا و جزا تو اِس دنیا میں بھی ہوتی رہی ہے۔یہ سب معجزات ہیں مگر انسان کو لگتے نہیں۔قرآن ان کو ان کی اصل شکل میں دکھاتا ہے۔

قرآن کا یہ اسلوب انسان کی نفسیات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔انسان غافل رہنے کا فیصلہ نہ کر لے تو دنیا کا یہ مسافر جنت کا مسافر بن جاتا ہے۔یہی قرآن کا اصل معجزہ ہے۔

قرآن کی دعوت: راہِ نجات

دورِ جدید میں دین کے حوالے سے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے بے پناہ کام ہوا ہے۔ خاص طور پر عملی کاموں کا معاملہ تو یہ ہے کہ دین کے نام پر جان، مال اور عزت و آبرو کی ان گنت قربانیوں کے ساتھ لوگوں نے جس طرح اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کیا، اپنا پیسہ، وقت، صلاحیت حتیٰ کہ پوری زندگی اس کام میں لگائی اور جو دکھ اور مصائب اس راہ میں جھیلے ہیں؛ اس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ ماضی قریب کا ایک واقعہ ہی نہیں بلکہ اِس وقت بھی لاکھوں لوگ اس مقصد کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ احیائے اسلام کا جو خواب دو سو برس سے دیکھا جا رہا ہے، اس کی کوئی تعبیر کہیں نظر نہیں آتی۔ سیاسی غلبہ تو ایک طرف رہا، علم و اخلاق کے معاملے میں بھی ہماری پستی دنیا بھر سے بڑھی ہوئی ہے۔ ایسے میں امت کا درد رکھنے والے ہر مخلص انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس صورتحال کا سبب کیا ہے؟ ہم نے پہلے بھی کئی دفعہ اس موضوع پر قلم اٹھا کر لوگوں کو توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ آج بھی انشاءاللہ اس تحریر کے ذریعے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس ضمن میں اصل غلطی کہاں ہو رہی ہے۔

اصل مسئلہ کیا ہے؟

موجودہ جدوجہد کا آغاز یورپی اقوام کے اس عالمی غلبے سے ہوتا ہے جو تقریباً دو صدی پہلے شروع ہوا اور بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ ہماری فکری قیادت نے اس معاملے کو دو قوموں کے ایک جھگڑے کے زاویے سے دیکھا۔ چنانچہ ان کا زاویہ نظر یہ بنا کہ ہم مظلوم ہیں اور ایک دوسری قوم

ظالم ہے جس نے باہر سے آکر ہمارے ملکوں پر قبضہ کرلیا ہے۔اس زاویہ نظر کے تحت آج کے دن تک ہمارا نظریہ یہی ہے کہ وہ ظالم اور ہم مظلوم ہیں ۔وہ غاصب اور ہم مجبور ہیں ۔ وہ غلط اور ہم درست ہیں۔

ہماری فکری قیادت اگر اس معاملے کو دو قوموں کے بجائے اپنے اور خدا کے زاویے سے دیکھتی تو ان کا ردعمل بالکل جدا ہوتا۔وہ جب اس پہلو سے اسلام کی بنیادی تعلیمات کی طرف لوٹتے تو معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی کسی قوم سے کوئی رشتہ داری نہیں ہوتی ۔اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی بھی قوم پر خالص میرٹ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔کوئی قوم لاکھ خود کو خدا کی چہیتی حتیٰ کہ خدا کی اولاد کی طرح سمجھے،لیکن اس کے ایسا سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔قرآن مجید نے اس معاملے کو بالکل صاف بیان کر دیا۔مثلاً یہود و نصاریٰ کی اسی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورہ المائدہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

''یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کی چہیتے ہیں۔ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے۔(ہرگز نہیں) بلکہ تم اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے انسان ہی ہو''،(المائدہ 18:5)۔

قرآن مجید نے ابتدائی سورتوں یعنی سورہ بقرہ سے مائدہ تک سابقہ امتوں کے پس منظر میں اس مسئلے پر بہت تفصیل سے کلام کیا ہے کہ جب کوئی قوم خدا کے نام پر کھڑی ہوتی ہے تو پھر نافرمانی کی شکل میں اسی دنیا میں اس پر سزا مسلط ہو جاتی ہے۔مسلمانوں نے اسے یہود و نصاریٰ ہی کا معاملہ سمجھا۔جبکہ درحقیقت یہ ایک اصولی قانون تھا جو قرآن کے آغاز میں بیان ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ مسلمان اس آئینے میں اپنی شکل دیکھتے رہیں۔وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں بلکہ یہ سمجھ لیں کہ جس طرح یہ قانون یہود و نصاریٰ کے لیے درست تھا اسی طرح مسلمانوں کے لیے بھی

درست ہے۔

قرآن مجید کی اس روشنی میں اگر جائزہ لیا جاتا اور مسلمانوں کے معروضی حالات کو نگاہ میں رکھا جاتا تو صاف معلوم ہوجاتا کہ جو کچھ دو صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ ہورہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی ایک سزا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سزا کی سادہ وجہ یہ ہے مسلمان ختم نبوت کے بعد واحد ذریعہ ہیں جس کے ذریعہ سے دنیا کو اللہ کی مرضی معلوم ہوسکتی ہے۔ مسلمان اگر دنیا کو اسلام کی دعوت نہیں پہنچاتے اور نہ اپنے عمل سے کوئی صالح نمونہ ہی پیش کرتے ہیں تو پھر وہ اس بات کے مستحق ہوجاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کے سامنے عبرت کا نمونہ بنادیں۔ مسلمان اگر خود دنیا کے سامنے حق کی شہادت نہیں دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو عبرت کا نشان بنا کر ان کے ذریعے سے حق کی شہادت قائم کردیں گے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں مسلمانوں کی اخلاقی پستی کی بنیاد پر ان کو سزا مل رہی ہے۔ مگر جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے معاملے میں ہوا تھا، یہ سزا دینے کے لیے آسمان سے عذاب نہیں آیا بلکہ انسانوں ہی میں سے لوگوں کو اٹھایا گیا اور ان کو بطور سزا مسلط کردیا گیا۔

اب اس بات کو اگر سزا سمجھا جاتا تو اصلاح احوال کا جذبہ پیدا ہوتا۔ مگر جب اس معاملے کو دو قوموں کا جھگڑا سمجھا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں اپنی اصلاح کا داعیہ تو نہ پیدا ہوا البتہ دوسروں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ آج کے دن تک ہماری فکری قیادت اور اس کے زیر اثر طبقات میں مغرب کی شدید نفرت اسی وجہ سے باقی ہے۔ مگر یہ نفرت نہ پہلے کوئی مسئلہ حل کرسکی تھی نہ اب کرسکی ہے۔ ہوا صرف یہ ہے کہ سزا دینے والی قومیں وقفے وقفے سے بدلتی رہی ہیں۔ پہلے یہ کام یورپی اقوام نے کیا، پھر سوویت یونین مسلط ہوگیا اور اب امریکہ یہ کام کررہا ہے۔ ہم نے اگر اب بھی اصل مسئلے کی درست تشخیص نہ کی تو آئندہ کوئی اور امریکہ کی جگہ لے لے گا۔ مگر

ہماری تباہی کے دن ختم نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہ قوم پرستانہ فکر جو اپنی اصلاح کے بجائے نفرت کو فروغ دیتی ہے ہماری تباہی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرے گی۔

اصلاح کرنے والوں کے مسائل

اس دوران میں سارے لوگ ایسے نہیں تھے جو اس مسئلے کو قومی یا سیاسی زاویے سے دیکھتے تھے۔ بلکہ بہت سے لوگ تھے جن کو یہ احساس ہوا کہ سیاسی جدوجہد اصل مسئلے کا کوئی حل نہیں اور اس کے لیے مسلمانوں کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مگر بدقسمتی سے ان کی جدوجہد میں کئی طرح کی خرابیاں درآئیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ اس نوعیت کی جدوجہد کرنے والے مختلف فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ان کا فرقہ ان کے لیے دین کے ہم معنی بن گیا۔ وہی ان کی شناخت قرار پایا۔ اسی کی طرف لوگوں کو بلانا ان کا مقصد قرار پایا۔ یوں ایک اصلاحی دعوت کے نتیجے میں جو لوگ اٹھے وہ فرقہ واریت کے شکار اور اپنے تعصّبات کے اسیر بن کر سامنے آئے۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اس چیز پر غور نہیں کیا کہ یہ امت صدیوں سے تقلید کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ امت کا پورا علمی، فکری، قانونی اور استدلالی ڈھانچہ زرعی دور میں وجود میں آیا ہے۔ اور جس طرح زرعی دور میں استعمال ہونے والے تیر وتفنگ کے ساتھ صنعتی دور کی کسی جدید فوج کا مقابلہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح قدیم فکری ڈھانچے کے ساتھ دور جدید کے عملی مسائل کا سامنا کرنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ اصلاح کے علمبردار بن کر کھڑے ہوئے، ان کے دینی جذبے کے باوجود عملی چیزوں میں ان کا رویہ ایسا تھا کہ ذہین اور باصلاحیت لوگ دین کو روح عصر کے خلاف اور دورِ جدید میں ناقابل عمل سمجھ کر کے اس سے دور رہے۔

ایک تیسرا مسئلہ یہ ہوا کہ گرچہ دین اسلام ایک محفوظ دین ہے، اس کی تعلیمات، اس کی

بنیادی کتاب، اس کے نبی کی سیرت ہر چیز محفوظ ہے۔ اس میں تبدیلی اور تحریف کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ ضرور ممکن ہے اور یہ ہوا بھی ہے کہ اس دین میں کئی اضافے ہوگئے۔ اصل، آسمانی اور ابدی دین کے ساتھ بہت کچھ وہ بھی موجود ہے جو وقتی، زمانی اور انسانی کام تھا۔ لوگوں نے ان دو چیزوں کے فرق کو سمجھے بغیر اس پورے کو دین کی دعوت بنا کر پیش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ظاہری اور سطحی چیزیں حق و باطل اور نیکی و بدی کا معیار قرار پائیں۔ وہ حقیقی تبدیلی جو دین انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ دنیا کے سامنے نہ آسکی۔

جن لوگوں نے ان غلطیوں کا ادراک کیا اور خود کو ان سے بچانے کی کوشش کی ان میں ایک اور مسئلہ پیش ہوگیا۔ وہ یہ کہ دینی مطالبات میں یہ لوگ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے جس کے نتیجے میں اس دینی دعوت کی ساری خوبصورتی اور جمال وجود میں آتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی دوسرے پر تنقید کرتے ہوئے استہزاء پر اتر آتے ہیں۔ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں اور خود کو بھول جاتے ہیں۔ کبھی دعوت و اصلاح کے کام کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کبھی دین کی رعایتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کہیں اصلاح کرنے والے ہستیوں کی شخصیت کے سحر کا اس طرح شکار ہوتے ہیں کہ خدا کے بجائے خدا کی طرف بلانے والے کے بندے بن جاتے ہیں۔

ان تمام غلطیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی اصلاح کے جذبے کے باوجود وہ کوشش جو بہت بڑے پیمانے پر برپا ہوئی اور جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ دین سے متعلق ہوئے، معاشرے میں فرقہ واریت، جمود، ظاہر پرستانہ سطحیت اور عدم توازن میں اضافے کے سوا کچھ نہ کرسکی۔

قرآن مجید: مسئلے کا حل

زمانہ قدیم میں قوموں کی اصلاح کے لیے انبیاء و رسل آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ

سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا ہے۔ تاہم ختم نبوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا اور خصوصی اہتمام یہ کیا ہے کہ اپنا کلام اپنی آخری کتاب کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اب یہ کتاب گویا کہ خدا اور اس کے رسول کے قائم مقام ہے۔ اس کتاب کی شکل میں اللہ تعالیٰ اپنا مدعا واضح الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔

اس حقیقت کو جان لینے کے بعد جب قرآن مجید کی طرف خالی الذہن ہو کر ہدایت پانے کے لیے رجوع کیا جاتا ہے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایمان و اخلاق کی دعوت کو اللہ تعالیٰ اصل مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ دعوت خدا کو زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بنانے کی دعوت ہے۔ یہ دعوت خدا کے حضور پیشی اور وہاں کی کامیابی کو زندگی کا سب سے بڑا ہدف بنانے کی دعوت ہے۔ یہ دعوت اِس دنیا میں اپنے آپ کو جسمانی، روحانی اور اخلاقی گندگی سے بچا کر خود کو پاکیزہ رکھنے کی دعوت ہے۔ اس دعوت کے نتیجے میں اعلیٰ انسان جنم لیتے ہیں۔ سچائی ایسے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔ دیانت و امانت ان کا وصف ہوتی ہے۔ حیا اور عفت ان کا سرمایہ ہوتی ہے۔ صبر اور معقولیت ان کی شناخت ہوتی ہے۔ رحم اور ہمدردی ان کی عادت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ان کا اصل ہدف اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو حق پہنچانے کے لیے بیتاب رہتے ہیں، مگر خود کو کبھی نہیں بھولتے۔ یوں ایسے لوگ تعصب، جمود، سطحیت، غفلت، شخصیت پرستی وغیرہ جیسی ہر کمزوری سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے فکر و عمل کی اساس قرآن کی آفاقی دعوت پر رکھ کر قرآن کے مطلوب انسان بن جاتے ہیں۔

ایسے اعلیٰ انسان جب کسی معاشرے میں پیدا ہونے لگیں تو آہستہ آہستہ خیر عام ہوتی ہے۔ اس سے لوگوں کی آخرت تو بلاشبہ اچھی ہوتی ہے مگر اس سے پہلے دنیا بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ دنیا نے صحابہ کرام کی شکل میں ایسے ہی اعلیٰ انسانوں کو دیکھا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے

دنیا میں بام عروج بخشا اور ان کے طفیل آنے والی کئی صدیوں تک مسلمان دنیا کی امامت کے منصب پر فائز رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی اسی دعوت میں آج بھی ہمارے لیے راہ نجات ہے۔ مگر بدقسمتی سے مذہب کے نام لیوا ایسی کسی آواز کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنی قوم پرستانہ فکر، فرقہ وارانہ سوچ، جمود اور سطحیت سے اوپر اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ قرآن کو خدا کا کلام ماننے کے باجود اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اس کو دین کا محور و مرکز بنانے پر آمادہ نہیں۔ اس کو میزان مان کر اپنی ہر فکر کو اس کی ترازو پر تولنے اور اس کو فرقان مان کر اپنے ہر فلسفہ کو اس کی کسوٹی پر پرکھنے کو تیار نہیں۔

ایسے میں ضرورت ہے کہ کچھ اور لوگ اٹھیں جو خواہش اور تعصب کے اس جنگل میں سچی بندگی، صدق ووفا اور حمیت دین کے نئے پھول کھلائیں۔ جو لوگ آج یہ پھول بنیں گے، کل قیامت کے دن انھی کو جنت کے باغوں میں آباد کیا جائے گا۔ مگر اس سے قبل اس دنیا میں ان کے صدقے میں باقی قوم پر رحم کیا جائے گا۔ تاہم قرآن مجید پر مبنی ایمان و اخلاق کی یہ صدا اگر رد کر دی گئی تو پھر خدا کا قہر فیصلہ کن طور پر بھڑکے گا۔ وہ عذاب آئے گا کہ لوگ ماضی کی ہر مثال بھول جائیں گے۔

ہم خدا کے قہر کے بھڑکنے سے قبل ہی اس کی پناہ مانگتے ہیں اور اس سے اس کی رحمت اور مغفرت کے طلبگار ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہمارا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

جہاں رہیں مخلوق خدا کے لیے باعثِ رحمت بن کر رہیں، باعثِ آزار نہ بنیں۔

ڈاکٹر شہزد سلیم/محمود مرزا

خوش اخلاقی

خوش اخلاقی ایک ایسا وصف ہے جو دلوں کو جیت لیتا ہے اور روح کو فتح کر لیتا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جس کے ذریعے سے کسی بھی فرد میں موجود انسانیت کے شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم ہمیں اس کہاوت کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انسان کی پہچان اس کے اخلاق سے ہوتی ہے۔

اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

- ایک شخص کا ہمارے لیے کوئی کام کرنا اس کا فرض ہو لیکن اس کے باوجود ہم اس کی خدمت کا شکریہ ادا کریں۔
- کسی شخص کو راستہ دینا جبکہ اس کا حق ہو نہ اس کی باری۔
- کسی کے لیے دروازے کو پکڑ کر رکھنا۔
- ذہنی طور پر پریشان ہونے کے باوجود کسی سے گرم جوشی سے ملنا۔
- اپنے ہر مطالبے کو ''برائے مہربانی'' اور ''از راہِ کرم'' کے الفاظ سے بیان کرنا۔
- کسی بزرگ یا مریض کے لیے اپنی سیٹ چھوڑ دینا۔
- کسی شخص کی یا کسی ٹیم ممبر کی نا قابلِ معافی غلطی پر بھی معاف کر دینا۔
- کسی شخص کی وضاحت کو سنتے ہوئے حسنِ ظن سے کام لینا یہاں تک کہ اس کی وضاحت میں صداقت دکھائی نہ دیتی ہو۔

آیئے ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ ہم ہمہ وقت خوش اخلاقی کے اس وصف کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں گے، اور دنیا و آخرت کی کامیابی کو اپنے لیے یقینی بنائیں گے۔

ثمر عمیر

اللہ تعالیٰ کی پہچان یا مصنوعی زندگی!

Tranquility of heart or disturbed soul

انسان کی زندگی میں کچھ عادتیں ایسی بن جاتی ہیں جن کے بغیر اس کا گزارا ممکن نہیں ہوتا اور بعض لوگوں کے لیے تو نشے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس لحاظ سے کہ جس طرح نشے کے بغیر انسان لاچار اور مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان چیزوں اور عادتوں کے بغیر اس کا پل پل کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے یا یوں کہیں کہ وہ اس پر سوار رہتی ہیں۔ ہر تھوڑے دن میں کوئی نئی عادت یا شوق نشے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں دیکھیں۔

دولت، عورت، کبھی علمی فوقیت کا سر پر سوار رہنا اور جب تک داد وصول نہ ہو جائے اس وقت تک بے چین رہنا، کبھی اعلیٰ اور با اثر شخصیات کی صحبت، کبھی فیس بک اور واٹس ایپ تو کبھی فلموں اور ڈراموں کا نشہ وغیرہ۔۔اس میں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو عادتیں پختہ بن جاتی ہیں یا نشے کے درجے پر پہنچ جاتی ہیں، اس میں سرشاری، لذت و لطف حاصل ہوتا ہے۔ اور جب وہ حاصل نہیں ہوتا تو اس انسان کے سکون کو تباہ کر دیتا ہے، وہ بے چین رہتا ہے یہاں تک کہ نشہ پورا کرنے کا موقع مل جائے یا نشہ مہیا ہو جائے۔

اسی لڑائی میں انسان اپنے نفس کے ساتھ جنگیں کرتے کرتے زندگی بتاتا ہے۔ کبھی وہ جیت جاتا ہے تو نفس ہار جاتا ہے اور کبھی وہ خود ہی نفس کے قابو میں آجاتا ہے۔ اس طرح کی کوئی بھی عادت غیر ضروری طور پر ہم پر اپنا تسلط جما لیتی ہے جبکہ اس کے بغیر گزارا ممکن ہے بلکہ بہت اچھا ممکن ہے لیکن انسان مصنوعی طور پر اس کو اپنے اوپر مسلط ہونے دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ سکون جو اسے ان عادات کے بغیر مہیا تھا وہ ان کو پورا کر کے اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے غیر

ضروری، غیر پاکیزہ عادتیں ہمیشہ بربادی کا باعث بنتی ہیں۔

انسان اس دنیا میں اچھی زندگی گزارے، حدود میں رہتے ہوئے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے لیکن حب دنیا۔۔۔یعنی۔۔۔(love of the worldly pleasure without moderation) انسان کو اپنے پیچھے زیادہ سے زیادہ بھگانا چاہتی ہے اور وہ جس قدر بھاگتا ہے اسی قدر مزید بھگانے پر اکساتی ہے۔ ایک خواہش یا نشہ پورا ہوتے ہی دوسری بار کی طلب شروع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ موت تک جاری رہتا ہے۔

اس کے برعکس ایک پاکیزہ سروراور خوشی کی قسم، وہ حالت بھی ہوتی ہے جب انسان اپنے رب کے حوالے سے کوئی دریافت (discovery) کرتا ہے، اس کے انداز اور حکمتیں اس پر بے نقاب ہوتے ہیں۔ اس کی تخلیق کے غیر معمولی پہلو اس پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی وحدانیت پر اس کو یقین ہو جاتا ہے اور رب کی اعلی صفات اسے گم کر دیتی ہیں۔ وہ اس کو داد دیے بغیر نہیں رہ پاتا، اس یقین کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ زندہ اور موجود ہستی کے طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں، اب اسے اللہ تعالیٰ سے گفتگو کر کے اتنا سکون ملتا ہے کہ۔۔۔ اس نے سن لیا جو تمام قوتوں اور طاقتوں کا مالک ہے مجھے وہ کافی ہے، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ سے گفتگو کر کے راحت پیدا ہوتی ہے، احساس تشکر سے وہ سرشار ہوتا ہے جب اس کی نظر ان تمام نعمتوں پر پڑتی ہے جو دن رات اسے بغیر مانگے ملی ہوئی ہیں۔ بار بار اللہ تعالیٰ کے لیے محبت محسوس کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس نے پہچاننا شروع کر دیا ہوتا ہے اور اس کو پہچاننے کا یہ سلسلہ انسان کے ذوق وشوق پر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کے آگے ایسے جھکا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی تمام کامیابیوں کا کریڈٹ دیتا ہے، اور ہمیشہ اپنی کامیابیوں کو اسی سے متعلق کرتا ہے جس سے اس پر اپنی ذات کی برتری کے بجائے اللہ تعالیٰ کی برتری قائم ہو جاتی ہے۔ یہ نقطہ نظر

اور سوچ قرآن کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔اس میں غور وفکر کے ذریعے انسان شعوری سطح پر اپنے رب تک پہنچ جاتا ہے۔

اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کا مطلب سمجھ جاتے ہیں کہ۔۔۔۔اللہ کی یاد سے ایمان اور تقویٰ کی زندگی گزارنے والے اطمینان قلب میں جیتے ہیں۔ان کی مزید خوبیاں یہ ہوتی ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف حالات ہوں یا ان کی چاہت کے مطابق یعنی اچھے حالات ہوں یا بُرے، ان کی شخصیت پرسکون ہوتی ہے۔مایوسی چھو کر بھی نہیں گزرتی، الزام تراشی سے ان کے ذہن دور دور تک خالی رہتے ہیں۔

چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے تعلق میں جڑے ہوتے ہیں لہٰذا اس سے گفتگو، دعا ومناجات کرنے کے علاوہ اس کی حکمتوں پر ان کی نظر پڑتی ہے تو ذہنی انتشار اور وقتی پریشانی امیدوں کی روشنی پا لیتا ہے۔ایسے لوگ اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ جو ہم مانگیں وہی ہمیں ملے بلکہ وہ نفس مطمئنہ کے درجے پر فائز رہتے ہوئے اپنے رب کی رضا پر راضی اور قانع ہوتے ہیں۔رب ان کے ساتھ اچھا ہی کرتا ہے،اس بات پر ان کا یقین اتنا پختہ ہوتا ہے کہ اپنی ذات اور تکالیف بھی انہیں بھول جاتی ہیں،اللہ تعالیٰ پر ایسا یقین اور مثبت رویہ دل کے اطمینان کی وہ کنجی ہے جس کا ذکر اس مفہوم میں آتا ہے کہ:

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

اچھی طرح سن لو کہ دلوں کا سکون اللہ (سے مضبوط تعلق، اچھا سوچنے، اس پر بھروسہ کرنے اور دعا ومناجات کر کے اس) کو یاد رکھنے میں ہے۔

خالد عثمان خان

شوہر کا بیوی پر کیا حق ہے؟

وہ پر جوش انداز میں شوہر کے حقوق کے بارے میں بول رہا تھا۔اس کے مطابق شوہر جیسے گھر کا خدا ہے۔آخر میں بولا کہ اگر شوہر کے سارے جسم پر پھوڑے اور زخم ہوں اور بیوی تمام زخموں اور اس سے رستے گندے مواد کو زبان سے صاف کرے تو بھی وہ شوہر کے حق کو پورا نہیں کرسکتی۔ مردوں کو تو مزا آرہا تھا لیکن ہماری فیمیل کولیگز کافی الجھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ gender balanced ماحول میں کام کرنے والیوں کے لیے ایسی باتیں ہضم کرنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔فرمان ابھی جاری تھا، بولے! اگر بیوی بچے بات نہیں مان رہے ہیں تو انھیں برابر ڈرانا اور مارنا چاہیے اور پھر وہی گھسا پٹا جملہ کہ اولاد اور بیوی کو سونے کا نوالا کھلاؤ لیکن دیکھو شیر کی نگاہ سے۔

مجھے ہنسی آئی اور کہا کہ اس طرح تو وہ بزدل گیدڑ بن جائیں گے۔ ان کی شخصیت مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ بیوی اور بچوں کو تو پیار سے سمجھانا چاہیے۔انھیں غلط کاموں کے نقصانات سے آگاہ کر کے منع کرنا بہتر طریقہ ہے۔اسی طرح بیوی کو مارنا یا سزا آخری مرحلہ ہوتا ہے اور وہ بھی اخلاقی بے راہ روی جیسے جرائم میں۔

سالن میں نمک زیادہ ہونے یا کپڑے وقت پر استری نہ کرنے جیسی غلطیوں پر بیوی کو مارنا جاہلوں کا طریقہ ہے۔اسی طرح بچوں کو ابتدائی عمر میں سنگین غلطیوں پر تادیب کر سکتے ہیں لیکن تھوڑا سا شور کرنے یا چھوٹی موٹی چیزوں پر بے دردی سے مارنا نہایت نامناسب بات ہے۔ بلکہ بچے اسے ناانصافی سمجھ کر بدظن ہوجاتے ہیں۔اسی طرح بیوی اگر اخلاقی بے راہ روی کی طرف مائل ہے تو پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اسے سمجھائیں۔اگر سمجھ نہیں رہی ہے تو دوسرے مرحلے پہ اپنا

بستر اس سے الگ کر لینا چاہیے۔اس طرح بھی نہ سمجھے تو خاندان کے دونوں طرف کے بڑوں کو سامنے بٹھا کر معاملہ صاف کر لیں۔اس کے باوجود بھی مان لینے پہ تیار نہیں تو اگر بیوی بہت عزیز ہے اور چھوڑنا نہیں چاہتے تو پھر قرآن نے اصلاح و تادیب کا جو راستہ بتایا ہے اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔جو طریقہ اللہ نے قرآن میں بتایا ہے وہ یقیناً حکمت سے بھر پور ہے۔

بیوی پر شوہر کا جو سب سے بڑا حق ہے وہ یہ ہے کہ وہ شوہر سے وفادار رہے۔اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔چھپ کر آشنائیاں نہ کرے۔اور شوہر کی اولاد میں ملاوٹ نہ کرے۔باقی خدمت اگر کرتی ہے تو یقیناً نیکی ہے لیکن لازم نہیں۔وہ بہر حال شوہر کی ساتھی ہے نوکرانی نہیں ہے۔شوہر کے بھائیوں اور والدین کے نخرے اٹھانا اس کے فرائض میں شامل نہیں۔بلکہ اس طرح کے معاملات شادی سے پہلے طے کرنے چاہئیں۔جاب کرنے کی اجازت،گھریلو ذمہ داریوں وغیرہ جیسے معاملات شادی کے وقت ہی طے کرنا چاہئیں۔

باقی باتیں ثانوی اہمیت کی ہیں۔اور ہمارے معاشرے میں بیوی کے مرتب کردہ فرائض اکثر زیادتی میں شمار ہو سکتے ہیں۔اسی طرح اگر عورت جاب کرنا چاہتی ہے تو یہ شادی کے وقت ہی طے کرنا چاہیے۔دین نے عورت کو کمانے سے منع تو نہیں کیا ہے لیکن اسے اس کے فرائض میں بھی شامل نہیں کیا ہے۔اسی طرح اگر بیوی کو شوہر کی خدمت کرنے پر ثواب ملتا ہے تو شوہر کو بھی بیوی کی خدمت کرنے پر ثواب ہی ملے گا۔یہی فطرت کا تقاضا ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔اللہ ہم سب کو تمام معاملات میں صحیح جگہ پر ہونے کی توفیق دے۔آمین

سوال وجواب

ابو یحییٰ

شریعت، نبوت اور عصر حاضر

محترم ! السلام علیکم۔ درج ذیل تحریر میں اٹھائے گئے سوالوں کا جواب دے دیں۔ یہ تحریر مبشر علی زیدی صاحب کی ہے، محمد ندیم اعظم۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ نبوت کا سلسلہ ختم نہ ہوتا تو نبی آج کے دور میں کیسے تبلیغ کرتے؟ یا سیکڑوں ہزاروں سال پہلے کے نبی آج آتے تو کیسے خدا کا پیغام پہنچاتے؟ کیا فقط خدا سے روشناس کرواتے یا قومی اور بین الاقوامی قوانین کی موجودگی میں شریعت بھی پیش کرتے؟ کیا یہ وہی ڈیڑھ ہزار سال پہلے پیش کی گئی شریعت ہوتی یا اس سے کچھ مختلف ہوتی؟ میں نے اس بارے میں کچھ علما اور مذہبی دانشوروں سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مجہول خیال ہے۔ مذہب اس بارے میں بحث نہیں کرتا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہزاروں سال پہلے آنے والا مذہب جو بتا چکا، وہ حرف آخر ہے۔

میرا خیال ہے کہ (اگر خدا ہے تو) خدا نے (اور اگر خدا نہیں ہے تو) مقدس ہستیوں اور دور اندیش بندوں نے جس دنیا کے لیے قوانین بنائے تھے، وہ زیادہ سے زیادہ اٹھارہویں انیسویں صدی تک کے لیے مناسب تھے۔ قومی ریاستوں کی تشکیل، ترقی یافتہ معاشروں کے ظہور، صنفی اور نسلی امتیاز کے خاتمے کی تحریک، خلا کی تسخیر اور میڈیکل سائنس کی ترقی نے مذاہب کے فلسفے کو بری طرح زک پہنچائی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام آج کے دور میں آتا تو خواتین کو گھر میں بند رہنے کے لیے نہ کہا جاتا، ان کی گواہی آدھی نہ ہوتی، وراثت میں حصہ کم نہ ہوتا، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حکم ہوتا، پسند کی شادی کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ کیا اکیسویں صدی میں آنے والا اسلام غلامی برقرار رکھتا؟ کیا غیر مذہب کے شہریوں سے جزیہ طلب کرتا؟ کیا مجرموں کے ہاتھ کاٹتا اور انھیں سنگسار

کرتا؟ کیا اکیسویں صدی میں آنے والا کوئی نبی اقتدار حاصل کرنا چاہتا؟ اور اگر اقتدار مل جاتا تو حکومت کیسے کرتا؟ فرض کریں کہ مدینے جیسی ریاست بننے کے خواہش مند پاکستان کا حکمران کوئی نبی ہوتا؟ وہ اقوام عالم کو کیسے تبلیغ کرتا؟ مسئلہ کشمیر کیسے حل کرتا؟ سود کے بغیر معیشت کیسے درست رکھتا؟ اسکینڈے نیویا کی ریاستوں سے بہتر فلاحی ریاست کیسے قائم کرتا؟

مجھے یہ بات بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اسلام آخری الہامی مذہب کیوں تھا؟ اس لیے کہ انسان کا شعور اس مقام پر آ گیا تھا کہ اس کے بعد مذہب کو ماننے والوں کی تعداد کم ہونی تھی، نہ ماننے والوں کو بڑھنا تھا۔ اب خدا بھی آسمان سے نیچے اتر آئے تو اسے اپنے آپ کو منوانے کے لیے کئی امتحانوں سے گزرنا ہوگا۔ میں خدا کو ماننے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوں لیکن اسلام کو مانتا ہوں۔ اس طرح مانتا ہوں کہ جو ٹھیک ہے، وہ اسلام ہے۔ جو غلط ہے، وہ کفر ہے۔

ملا ازم یہ ہے کہ جو ملائیت ہے، وہ اسلام ہے۔ جو ملائیت نہیں ہے، وہ کفر ہے۔ ملائیت کا حال یہ ہے کہ گلیلیو نے جب بتایا کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے تو پادریوں کا مذہب خطرے میں پڑ گیا تھا۔ آج اسلام کا مرکز خانہ کعبہ ہے لیکن سوچیں کہ کل انسان چاند یا مریخ پر آباد ہو گیا تو کس طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا؟ مذہب اس بات کا جواب نہیں دیتا کیونکہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ سوال پیدا نہیں ہوا تھا۔ آپ کسی ملا سے بات کر کے دیکھیں، وہ آج بھی اس بات کا جواب نہیں دے گا۔ مذہب کے پاس اکیسویں صدی کی دنیا کے بہت سے سوالات کے جواب نہیں ہیں۔ مذہبی علما اگر کسی سوال کا جواب دیتے ہیں تو اپنے فہم کے مطابق دیتے ہیں۔ ان کا فہم کسی نبی کے فہم جیسا نہیں۔ چنانچہ میں انھیں مذہب کا ترجمان ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ میں ان کی تقلید کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ یہ تحریر بھیجنے کا شکریہ۔ اٹھائے گئے نکات کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ مذہب کا نقطۂ نظر بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ مگر صاحب مضمون اسی تحریر میں فرماتے ہیں کہ وہ

خدا کو ماننے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ جب معاملہ یہ ہو کہ آدمی خدا کو ماننے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو تو پھر گفتگو نبوت اور شریعت پر نہیں ہونی چاہیے، خدا کے وجود پر ہونی چاہیے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص نبیوں کے بھیجنے والے اور شریعت کے نازل کرنے والے کے بارے میں ہی میں شک وشبہ کا شکار ہے تو نبوت اور شریعت پر گفتگو کارِلا حاصل ہے۔ اس لیے گفتگو کی مناسب جگہ یہ ہے کہ وہ بتائیں کہ ان کے پاس خدا کے انکار اور اپنی تشکیک کی کیا وجوہات ہیں؟ گفتگو تو اس پر ہونی چاہیے نہ کہ شریعت اور نبوت پر۔

البتہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے بارے میں ان کے ذہن میں شکوک ہی اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ خدا وہ ساری باتیں کہہ رہا ہے جو انھوں نے اپنی تحریر میں نقل کی ہیں اور وہ ان کے نزدیک غلط ہیں۔ اگر ایسا ہے تو خدارا یہ سب کچھ پبلک میں لکھنے اور کہنے سے قبل تحقیق فرما لیتے تو وہ جان لیتے کہ یہ تمام باتیں یا تو خدا نے کہی نہیں ہیں یا پھر اس کی بات کی غلط ترجمانی کو خدا کی بات سمجھ لیا گیا ہے۔ خدا کی طرف اپنا فہم یا انسانوں کا فہم منسوب کر کے خدا کے وجود پر شک کرنا کوئی معقول اور علمی رویہ نہیں۔ ان کی بیان کردہ ہر بات کے بارے میں بتایا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کا غلط فہم ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم بطور مثال ان کا ایک اعتراض نقل کر کے اپنی بات کو واضح کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں یہ بات لکھی ہے کہ اسلام میں عورتوں کی گواہی آدھی ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مذہبی علماء کو مذہب کا ترجمان ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ عورت کی آدھی گواہی کی بات ہی علماء کرتے ہیں، اللہ کا کلام تو ایسی کسی بھی بات سے بالکل خالی ہے۔ اگر ہے تو بتائیے کہ قرآن کی کس آیت اور کس سورت میں کہا گیا ہے کہ عورت کی گواہی آدھی ہے۔ یہ مثال اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کو اصل مسئلہ مذہبی علماء سے ہے اور اسے انھوں نے اللہ کے کھاتے میں ڈال دیا۔ بھائی اللہ کا کلام تو موجود ہے۔ خدا تو اپنی کتاب میں بول رہا ہے۔ اس کی کسی بات پر اعتراض ہے تو بتائیں۔ انسانوں کے فہم کو خدا کی طرف منسوب کر کے خدا کا انکار

کرنا نامعقولیت کے سوا کچھ اور نہیں۔

یہاں قارئین کے لیے قرآن کی اس آیت کی وضاحت ضروری ہے جہاں سے لوگ عورت کی آدھی گواہی نکالتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ وہاں عورت کی آدھی گواہی کا کوئی تصور نہیں دیا گیا۔یہ سورہ بقرہ کی آیت 282 ہے جس میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ لین دین کے کسی معاملے میں گواہ ضرور مقرر کرو اور یہ گواہ دو مرد ہونے چاہئیں۔اللہ تعالیٰ کا صاف مدعا یہ ہے جب گواہ مقرر کرنا تمھارے اختیار میں ہو تو کسی عورت کو گواہ بناؤ ہی نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات بارہا عدالتوں میں چلے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ عورتیں عدالتوں میں جج اور وکیلوں کی جرح کا سامنا کریں۔اس لیے ان کا ابتدائی حکم تو یہ بیان ہوا ہے کہ کوئی عورت بھی گواہ نہیں بننی چاہیے۔لیکن بعض حالات میں یہ ممکن نہیں ہوتا تو ایسے میں اگر دو مرد نہ مل سکیں تو پھر مجبوری میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں گواہ بنالی جائیں کہ ایک عورت عدالت کے ماحول اور تیز و تلخ سوالات سے گھبرا کر بات بھولنے لگے تو دوسری اس کی مدد کردے۔اس پہلو سے جب دیکھیں گے تو یہاں آدھی پوری گواہی کا کوئی مسئلہ زیر بحث ہے ہی نہیں۔بات یہ زیر بحث ہے کہ دستاویز لکھتے وقت گواہ ضرور بنایا کرو۔لیکن اس میں عورتیں گواہ نہ بنائی جائیں اور مجبوری ہو تو ایک کی جگہ دو بنائی جائیں۔یہ عورت کی گواہی کو آدھا کرنے کا عمل نہیں بلکہ ان کے تحفظ کا ایک عمل ہے۔اس پر کسی معقول انسان کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ یہ ایک سماجی ہدایت ہے۔عدالت اور حکمرانوں کو گواہی کی قبولیت کا کوئی ضابطہ نہیں دیا گیا۔کبھی کسی شہری نے اس ہدایت کی پابندی نہیں کی اور معاملہ عدالت میں چلا گیا تو جج اس بنیاد پر فیصلہ کرنے کا پابند نہیں کہ کون گواہ تھا اور کون نہیں۔نہ وہ اس بنیاد پر کیس سننے سے انکار کرسکتا ہے کہ قرآن کی بات کی پابندی نہیں کی گئی۔اللہ تعالیٰ نے حکمرانوں اور عدالتوں کو ایسے کسی ضابطے کا پابند نہیں کیا ہے۔اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن نے عورتوں کو کچھ آداب سکھائے ہیں جن کا اہتمام اجنبی مردوں کی موجودگی میں کرنا

چاہیے۔ اگر کوئی عورت یہ اہتمام نہ کرے اور اس کے ساتھ زنا بالجبر یا دست درازی کردی جائے تو عدالت اس بنیاد پر کیس خارج نہیں کرسکتی کہ خاتون نے قرآنی احکام کی پابندی نہیں کررکھی تھی۔ اسے کیس کو اس کے میرٹ پر سننا ہوگا۔ یہ بات اگر واضح ہے تو پھر آدھی گواہی والا اعتراض کم از کم اس کتاب پر تو وارد نہیں ہوتا جو ابِ آسمان کے نیچے خدا کا واحد مستند اور محفوظ کلام ہے۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہے کہ مصنف نے خدا کے احکام اور اس کے کلام کو پوری طرح سمجھے بغیر تشکیک کی راہ اختیار کرلی ہے۔ سنی سنائی باتوں پر تشکیک وانکارِ خدا جیسی آخری حد پر چلے جانا غیر سنجیدگی اور سطحی اندازِ فکر کی علامت ہے۔ یہ وہ دو امراض ہیں جو کسی کو لاحق ہو جائیں تو پھر کوئی علمی گفتگو کرنا ممکن نہیں رہتا۔

آخری گزارش یہ ہے کہ ہم جس کائنات میں جی رہے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے کہ بغیر خدا کے اس کی کوئی توجیہ کی جاسکے۔ جو لوگ بے چارے ارتقا سے یہ خدمت لے کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیتے ہیں ان کی خدمت میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی ''ملائیت'' کہیں زیادہ نامعقول ہے۔ اس نامعقولیت کے بجائے سچائی کی تلاش کا راستہ اختیار کیجیے۔ خدا کی جنت اپنے تعصب سے اوپر اٹھ کر سچائی کو قبول کرنے کا بدلہ ہے۔ خدا نے ایسے ہی قیمتی لوگوں کو ڈھونڈنے کے لیے دنیا کا یہ امتحان برپا کیا ہے اور امتحان ہی کی غرض سے خود کو پردہ غیب میں مستور کردیا ہے۔ اب جس کا دل چاہے وہ اپنے تعصّبات سے چمٹا رہے اور جس کا دل چاہے سچائی کا راستہ اختیار کرلے۔ وہ وقت بہت دور نہیں جب خدا غیب کا پردہ اٹھا کر سارے معاملات کا فیصلہ خود ہی کردے گا۔ وہ دن ان لوگوں کے لیے بہت رسوا کن ہوگا جنھوں نے اپنے شرفِ انسانی یعنی اپنی عقل کو اپنے تعصّبات کی نذر کردیا۔

والسلام

بندہ عاجز

ابویحییٰ

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (56)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی درست اساسات: ذکر و فکر اور دعا

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی اساسات کا بیان ایمان سے شروع ہوا تھا جو انکار سے اقرار کا وہ سفر ہے جو ایک بندہ عاقل عقل و فطرت کے دلائل کی روشنی میں طے کرتا ہے۔ پھر ان کی تصدیق وہ اپنی فطرت میں پاتا اور اپنے حالات میں دیکھتا ہے۔ یہ یقین اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ زندگی میں ہر اس جگہ جہاں خدا کا حکم موجود ہو خود کو اس کے حوالے کر کے اس کی فرمانبرداری کی راہ اختیار کر لے۔ اللہ سے تعلق کی دوسری اساس مادی اور روحانی نعمتوں سے پیدا ہونے والا وہ احساس تشکر ہے جو پہلے محبت میں بدلتا ہے اور پھر جب جب ضرورت ہو یہ محبت، حمیت و نصرت کے جذبے میں ڈھل جاتی ہے۔ اس تعلق کی ایک بہت اہم اساس ذکر و فکر اور دعا ہے۔

ذکر و فکر اور دعا

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی ہر وہ بنیاد جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے بڑی اہم ہے اور ان کے بغیر انسان بندگی اور روحانی زندگی کا تجربہ نہیں کر سکتا لیکن ذکر و فکر اور دعا کی اساس وہ ہے جو انسان کو آخری درجہ میں اپنے رب سے جوڑ دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اگر خدا کی دریافت، اور شکر اسے نعمتوں میں پانے کا نام ہے تو ذکر و فکر خدا کی معیت میں ہمہ وقت جینے کے ہم معنی ہے۔

ذکر عام تصور کے برعکس الفاظ کی مالا جپنے کا نام نہیں۔ یہ کسی کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کی وہ کیفیت ہے جس سے عام انسانی تعلقات میں ہم ہر روز گزرتے ہیں۔ کوئی بیٹا اگر والدین سے

دور بیرون ملک پڑھنے کے لیے گیا ہوا ہو تو وہ اسے یاد کرتے ہیں۔ انھیں اس کی ایک ایک ادا یاد آتی ہے۔ اس کی شکل ان کی آنکھوں میں پھرتی ہے۔ اس کا تصور ان کے روز وشب کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کی باتیں، اس کی عادتیں، اس کی پسند و ناپسند ہر چیز انھیں یاد آتی ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا نام بھی پکار لیتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کی تعریف بھی کر دیتے ہیں۔ دل بھر آئے تو اس کی یاد میں ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ غرض یہ وہ ساری کیفیتیں ہیں جن سے ہم گزرتے بھی ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

خدا کی یاد اس سے کچھ زیادہ مختلف چیز نہیں ہے۔ لیکن خدا کی ہستی چونکہ مخلوق سے بالکل مختلف ہے اس لیے نہ اس کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہمارا خیال اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خود اپنی یاد کی بنیادیں عطا کی ہیں۔ یہ بنیادیں خدا کی حمد، تسبیح اور کبریائی کا قرینہ ہے جو خدا کا بہترین تعارف بھی ہے۔ حمد اس بات کا اعتراف ہے کہ خدا صاحب جمال ہے۔ اس سے صرف خیر کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ یکطرفہ طور پر دینے والا ہے۔ اس کی عطا و بخشش کا دروازہ ہر مخلوق کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس کا فیض اور اس کی برکات ہر سُو برس رہی ہیں۔ ہر حسن اس کی عطا سے مزین، ہر ساز اس کے آہنگ سے نغمہ زن اور ہر رنگ اس کے فیض سے منور ہے۔ کسی وجود میں اپنی ذات میں کوئی خوبی نہیں۔ ہر خوبی خدا میں ہے اور کسی کو کچھ ملتا ہے تو اسی کی برکت کا ظہور ہوتا ہے۔ لہٰذا وہی تعریف کا مستحق ہے۔ وہی ہر تعریف کا مستحق ہے۔

حمد اگر اس بات کے اظہار کا نام ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے تو تسبیح اس بات کے اعتراف کا نام ہے کہ اس میں کوئی خامی نہیں۔ تسبیح اس سچائی کا اظہار ہے کہ خدا ہر کمزوری سے پاک ہے۔ ہر عیب سے بری ہے۔ وہ ایسا صاحب کمال ہے کہ اسے کسی معاملے میں کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔ وہ ایسا کامل ہے کہ ماں، باپ، اولاد، ساجھی اور معاون کی ہر اس ضرورت سے پاک ہے

جس کی ہر مخلوق محتاج ہے۔اس کی کوئی صفت ایسی نہیں جو کسی شر کے ظہور کا سبب بنے۔اسے کسی قسم کا عجز اور احتیاج لاحق نہیں ہوتا۔ یہ صاحب جمال اور صاحب کمال خدا اپنی ذات میں ہر چیز سے بڑا ہے۔خدا کی کبریائی بیان کرنا اسی حقیقت کے اعتراف کا نام ہے۔ یہ خدا کو بڑا مان کر اس کے جلال ، بزرگی اور بے پناہ عظمت کے اعتراف کا نام ہے۔اس بات کو ماننے کا نام ہے کہ خدا مخلوق کی ہر سوچ ، ذہانت کی ہر سطح اور گمان کی ہر حد سے بلند اور اعلیٰ ہے۔

خدا کی یہ یاد کائنات میں غور و فکر سے جنم لیتی ہے۔تفکر عقل کا وظیفہ ہے جو انسان کا اصل شرف ہے۔ یہ نظر آنے والے حقائق سے نظر نہ آنے والے حقائق تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ جبکہ یہ عقل انفس و آفاق کی نشانیوں سے گزر کر ان کے خالق کو دریافت کرتی ہے تو تفکر کی اس عبادت کو جنم دیتی ہے جو صرف ایک بندہ مومن ہی کا خاصہ ہوتی ہے۔ایک منکر خدا اسباب میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔جبکہ ایک مشرک کی پہنچ غیر اللہ سے آگے نہیں بڑھتی ۔مگر فکر کی عبادت ایک بندہ مومن کو اسباب اور مخلوق سے اٹھاتی ہے اور وہ ہر معاملے میں خالق کی حکمت ،قدرت ، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھ لیتا ہے۔ یہی وہ تفکر ہے جو خدا کی یاد کو الفاظ کی شکل میں زبان پر جاری کر دیتی ہے۔جس کے بعد بندہ مومن کبھی رب کی حمد کرتا، کبھی اس کی پاکی بیان کرتا ہے اور کبھی اس کی بڑائی کے نغمے گاتا ہے۔

تاہم ذکر و فکر صرف حمد، تسبیح اور تکبیر رب تک ہی محدود رہنے والی چیز نہیں ۔انسانی فکر جب خدا کو نئے نئے پہلو سے دریافت کرتا ہے تو اس کا وجود سراپا دعا جاتا ہے۔وہ کبھی اسے اس کی ختم نہ ہونے والی ان صفات سے یاد کرتا ہے جن کی صناعی کے جلوے چار سو پھیلے ہیں۔کبھی تڑپ کر اس کو بے تابانہ پکارتا ہے۔کبھی دل میں اسے محسوس کرتا ہے اور کبھی بہتی آنکھوں کے سمندر میں ڈوب کر غم دنیا کو بھلا دیتا ہے۔غرض بے حد وحساب خدا کو یاد کرنے کے بھی بے حد وحساب

اسالیب ہیں جو ہر زندہ انسان ہر بندہ مومن اپنے اپنے پہلو سے ڈھونڈ سکتا ہے۔

تاہم خدا کو یاد کرنے والا یہ انسان ایک بندہ عاجز ہے۔ وہ سراپا ضرورت ہے۔ اس کے عجز کا یہ تقاضا ہے کہ وہ خدا کے حضور پیش ہو کر اس سے اپنی ضرورتیں مانگے۔ اپنی خواہشات اس ہستی کے سامنے رکھے جس کی قدرت کے نمونے چارسو پھیلے ہیں۔ عافیت، آسانی، مدد و استعانت کے ہر زاویے سے خدا کو پکارے۔ چپکے چپکے اور گڑگڑا کر اس کے حضور فریاد کرے۔ اس کی قربت، سماعت، دید اور قدرت کا یقین رکھتے ہوئے اسے پکارے۔ اس یقین کے ساتھ کہ دینے والے کے پاس سب کچھ ہے اور وہ دے بھی سکتا ہے۔ بس مانگنے کی دیر ہے۔ اس کے دربار سے کوئی شخص کسی صورت خالی نہیں لوٹتا۔ پکار سنی جاتی ہے۔ در قبولیت کھولا جاتا ہے۔ عطا و بخشش کا فیض جاری ہوتا ہے۔ گرچہ ضروری نہیں کہ اس عطا کی شکل وہی ہو جو ہم مانگ رہے ہیں۔ مگر یہ طے ہے کہ مانگنے والے کو ملتا ضرور ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی جہاں اور پہلوؤں سے اسوہ حسنہ ہے وہیں ذکر و فکر اور دعا میں بھی آپ کے بیان کردہ اذکار، معمولات اور دعائیں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ ان کو اختیار کرنا دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ ہے۔

قرآنی بیانات

''اے ایمان والو! تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، اور اس کی تسبیح کرو صبح اور شام''، (الاحزاب 41-42:33)

''اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ ان کے لیے جو اللہ کی ملاقات اور روز آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔''، (الاحزاب 21:33)

''اور تمہارے رب کا ارشاد ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ

میری بندگی سے سرتابی کر رہے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔''، (الغافر 60:40)

''اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔تو چاہیے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔تا کہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔''،(البقرہ 186:2)

''تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میری شکر گزاری کرتے رہنا، میری ناشکری نہ کرنا۔''،(البقرہ 152:2)

''اس نے کہا اے میرے رب تو میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دے۔فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔''،(آل عمران 41:3)

''اپنے رب کو پکارو گڑ گڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''،(الاعراف 55:7)

''اپنے خداوند برتر کے نام کی تسبیح کر۔''،(الاعلیٰ آیت 87 :1)

''اور کہو کہ شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی حاجت ہے اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔''،(بنی اسرائیل 111:17)

''شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب۔رحمان اور رحیم۔ جزا و سزا کے دن کا مالک۔ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں''،(الفاتحہ 1 :1-4)

''اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔اور اپنے رب کی کبریائی کی منادی کر''، (المدثر 1-3:74)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (60)

ریحان صاحب مزید لکھتے ہیں۔

''یہ سانحہ تاتاریوں کا مسلم دنیا پر حملہ تھا جس نے ساتویں صدی ہجری میں وسطی ایشیا سے لے کر مشرق وسطی تک تمام عالم اسلام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مسلم دنیا کے تمام تہذیبی اور علمی مراکز (بجز اسپین کے جو بعد میں مسیحیوں کے ہاتھوں برباد ہو گیا) اس آفت کی نذر ہو گئے۔ اس فتنہ کا نقطہ عروج بغداد کی تباہی کا سانحہ تھا جو 1258ء (بمطابق 656ھ) میں پیش آیا۔ جس کے بعد مسلم دنیا پر تباہی و بربادی کی وہ المناک رات مسلط ہوئی جس کی مثال انسانی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔

مسلم معاشرہ، ریاست، سیاست، علم، تہذیب غرض ہر شعبہ زندگی پر اس کے ایسے منفی اثرات مرتب ہوئے جن سے مسلمان کئی صدیوں تک باہر نہ نکل سکے۔ مسلمانوں نے سیاسی اعتبار سے اپنا کھویا ہوا مقام سلطنتِ عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت کی شکل میں کسی نہ کسی طرح واپس لے لیا، لیکن علمی طور پر وہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔ ایسے تباہ حال مسلم معاشرے میں اہل تصوف کا اثر و نفوذ مزید بڑھ گیا۔ خاص کر عالمِ عجم میں تصوف کی مختلف شاخوں اور خانوادوں کے سلسلے پھیلتے چلے گئے۔ اہلِ شریعت کے بالمقابل اہلِ طریقت ہی اصلاً معاشرے کی فکری قیادت کے منصب پر فائز ہو گئے۔

اس دور میں ہندوستان مسلمانوں کا فکری مرکز بن چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم اقتدار کا یہ واحد خطہ تھا جو فتنہ تاتار سے محفوظ رہا تھا۔ چنانچہ پورے وسطی ایشیا، ایران اور مشرق وسطیٰ سے مسلم شرفا، علما اور صوفیا ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ سرزمینِ ہند اپنے سیاسی حالات، تاریخی پس

منظر، مذہبی روایت اور فلسفیانہ افکار کی بنا پر تصوف کے پودے کی زرخیری کے لیے ایک بہترین جگہ تھی۔ چنانچہ شجرِ تصوف یہاں خوب پھلا پھولا اور اس کے بطن سے خواجہ معین الدین چشتی (م 627ھ)، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م 633ھ)، خواجہ فرید گنج شکر (م 664ھ)، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م 665ھ) اور شیخ نظام الدین اولیا (م 725ھ) جیسے اکابرینِ تصوف نے جنم لیا۔

مغلیہ سلطنت کے زمانے تک ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت غیر مقامی حکمرانوں کی نہیں رہی تھی بلکہ بحیثیت قوم یا گروہ ان کا اجتماعی تشخص واضح ہونے لگا تھا۔ لیکن حکومت کے باوجود ہندوستان میں مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہرحال اقلیت میں تھے۔ دوسری طرف اس معاشرے میں اہل تصوف کی حیثیت صرف صوفیا ہی کی نہیں بلکہ مسلم معاشرے کے فکری رہنماؤں کی بھی تھی۔ اس پس منظر میں ہند میں تصوف کی روایت علمی اور سیاسی طور پر بھی فعال ہونے لگی۔ اس میں ایک طرف شیخ احمد سرہندی (م 1033ھ) جیسے صاحبِ علم وفضل اور صاحبِ عزیمت لوگ پیدا ہوئے تو دوسری طرف شاہ ولی اللہ (م 1762ء بمطابق 1176ھ) جیسے بے نظیر عالم اور مدبر پیدا ہوئے جن کی نظیر تاریخ اسلام میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک مثال سید احمد شہید (م 1831ء بمطابق 1246ھ) اور شاہ اسماعیل (م 1831ء بمطابق 1246ھ) کی ہے جو صاحبِ سیف وقلم تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے یہ دونوں بزرگ تصوف کی روایت سے منسلک تھے، خاص طور پر شاہ اسماعیل صاحب جن کی تصنیف 'عبقات' تصوف کی ایک بہت اہم کتاب ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی کا زمانہ مسلمانوں کے ہمہ جہتی زوال کا دور تھا۔ عالمِ اسلام تقلید و جمود کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ علمی وفکری جمود اور سیاسی و معاشرتی انحطاط کی لہر ہر جگہ اپنے

اثرات مرتب کر رہی تھی۔ دوسری طرف اہلِ مغرب تقلید کی بیڑیاں کاٹ کر اور علم و عقل کو امام بنا کر موڈرن ازم یعنی جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ سائنسی اور سماجی علوم میں ترقی کے ہتھیار سے لیس ہو کر نکلے اور پورے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس کے ردعمل میں عالم اسلام میں جو احیائی تحریکیں یا افکار وجود میں آئے، ان سب نے یہ محسوس کیا کہ تصوف اس جمود و بے عملی کو پیدا کرنے میں ایک بنیادی کردار ادا کر رہا ہے اور تصوف کی اعلیٰ اخلاقی روایات گدی نشینوں کے مفادات پر قربان ہونے لگی ہیں۔ اس صورتحال پر اقبال (م 1938ء) جیسے بڑے لوگوں نے تنقید کی اور اپنی پرجوش شاعری سے لوگوں کو علمی و عملی جمود توڑنے پر آمادہ کیا۔ اِس زمانے میں سیاسی حالات سے متاثر ہو کر جو مسلم احیائی تحریکیں وجود میں آئیں ان میں اہل تصوف کا زیادہ کردار نہ تھا۔ مزید یہ کہ ابن تیمیہ کے زیر اثر عرب میں جو احیائی تحریک اٹھی وہ تصوف کے قطعاً خلاف تھی۔ خود برصغیر میں پیدا ہونے والی اسلام کے سیاسی انقلاب کی تعبیر اپنی روح کے اعتبار سے تصوف کے خلاف تھی۔ اس سے وابستہ بڑے اہل علم نے تصوف پر شدید تنقیدیں کیں۔

امت کی تاریخ میں ایک طویل عرصہ بعد فکری قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو تصوف کے خلاف تھے یا اس سے زیادہ ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ نیز جدید تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحانات بھی اس بات میں مانع ہوئے کہ لوگ اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے منہ پھیر لیں۔ مسلم معاشرہ مغرب کی جدیدیت کا براہِ راست اثر قبول کر رہا ہے جس میں تقلید کے مقابلے میں آزادی اور باطنی تجربات و مشاہدات کے مقابلے میں عقلیت کو بہرحال ترجیح حاصل ہے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر مسلم معاشرے میں اہل تصوف کے کردار کو بہت محدود کر دیا ہے اور زمانہ قدیم کی طرح آج اعلیٰ اذہان تصوف کی تحریک سے کم ہی وابستہ نظر آتے ہیں۔''، (انسان کا

مسئلہ)

میرے خیال میں دور جدید میں تصوف کے زوال کی ایک بڑی وجہ اہل تصوف کا اپنا کردار ہے۔ قدیم دور کے صوفی اپنے مشن سے مخلص ہوا کرتے تھے۔ ان کے اندر دولت کی طلب نہ ہوا کرتی تھی۔ موجودہ دور میں زیادہ تر صوفیاء نے اپنے روحانی سلسلوں کو جاگیر بنالیا ہے جو وراثت کی طرح ان کی اگلی نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ اب پیری مریدی کا سب سے بڑا مصرف یہی بنادیا گیا ہے کہ بے وقوف مریدوں کو ذہنی طور پر غلام بنا کر ان کی دولت پر عیش کی جائے۔

اسلام اور تصوف

مسلمانوں کی پوری تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو مسلم صوفیاء میں تین غالب رجحانات نظر آتے ہیں:

صوفیاء کے پہلے گروہ کا مقصد صرف اور صرف ''تزکیہ نفس'' ہے۔ یہ لوگ قرآن وسنت کا علم حاصل کرتے ہیں اور اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور اس طریقے سے لوگوں کی شخصیتوں کو نفسانی آلائشوں سے پاک کرتے ہیں۔ یہ لوگ بدعات سے پرہیز کرتے ہیں اور ان کی پوری زندگی شریعت کے مطابق بسر ہوتی ہے۔ اس قسم کے صوفیاء کا سراغ مسلمانوں کی ابتدائی صدیوں میں ملتا ہے۔ سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جیسی نابغہ روزگار شخصیات اس کی مثال ہیں۔ موجودہ دور میں صوفیاء کا یہ گروہ ناپید ہوتا جارہا ہے۔

صوفیاء کا دوسرا گروہ وہ ہے جو شریعت کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے۔ ان کے نزدیک دینی علوم محض ظاہری علوم ہیں۔ اصل علم باطن کا علم ہے جو ظاہری حواس سے نہیں بلکہ باطن کی آنکھ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس گروہ کے صوفی کھلے عام فحش کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں، نشہ آور اشیاء استعمال کرتے ہیں، مزاروں کی پوجا کرتے ہیں اور شریعت کی تمام حدود کو توڑتے ہیں۔

صوفیاء کا تیسرا گروہ وہ ہے جو شریعت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے البتہ انہوں نے ایسے بہت سے تصورات اوراورادومشاغل ایجاد کرر کھے ہیں جن کا دین میں کوئی تصور نہیں ملتا۔اس گروہ کے صوفی عام طور پر دینی اعتبار سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ صوفیاء کے دوسرے گروہ کی شدید مذمت کرتے ہیں اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے بات کرتے ہیں۔ان کے نقطہ نظر کے مطابق پہلے گروہ سے تعلق رکھنے والے صوفیاء اصلی نہیں ہوتے۔اس تیسرے گروہ میں بعض بڑے مذہبی علماء بھی شامل رہے ہیں۔اس وقت یہی تیسرا گروہ صوفیاء کی اکثریت پر مشتمل ہے۔

پہلے گروہ کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ دین پر پوری طرح عمل پیرا ہوا کرتے تھے۔دوسرے گروہ کے بارے میں بھی بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کی تردید تو خود شریعت پسند صوفی کرتے ہیں۔تیسرے گروہ کے بعض بزرگوں کے ساتھ مجھے وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ان کے نظریات اور اعمال کا اگر اللہ تعالی کے کلام قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو چند ایسے معاملات ہیں جن میں ان کے عقائد واعمال قرآن وسنت سے بالکل متضاد نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ان اہل تصوف کے ساتھ میرا جو تجربہ رہا ہے، اس کے نتیجے میں چند ایسے معاملات میرے سامنے آئے ہیں جہاں تصوف کی روایت قرآن وسنت سے بالکل مختلف نقطہ نظر پیش کرتی نظر آتی ہے۔

قرآن مجید اور مروجہ صوفی ازم کی تعلیمات میں سب سے بڑا تضاد ''وحدت الوجود'' (Pantheism) کا نظریہ ہے۔صوفیاء کی اکثریت اس نظریہ کی قائل ہے۔قرآن کا تصور توحید تو یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ باقی سب اس کی مخلوق ہے۔اکابر صوفیاء قرآن کے اس تصور توحید کو ''عوام کی توحید'' قرار دیتے ہیں۔ان کے خیال میں لا الہ الا اللہ کی توحید عام لوگوں کی توحید ہے۔ان کے نقطہ نظر کے مطابق توحید ''لا موجود الا اللہ'' ہے۔اس کا معنی یہ ہے کہ

کوئی بھی چیز خدا کی مخلوق نہیں ہے۔ اس کائنات میں صرف ایک ہی وجود ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

بظاہر تو یہ نظریہ توحید کا بڑا علمبردار نظر آتا ہے مگر ذرا سا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ ایک بہت بڑے شرک کی راہ کھول دیتا ہے۔ اگر کائنات میں خدا کے سوا کچھ نہیں ہے تو یہ جو سب کچھ نظر آتا ہے، یہ خدا ہی ہوئے۔ اس کے بعد انسان کا اپنا وجود بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ہر انسان خدا ہی ٹھہرا۔ صرف انسان ہی پر کیا موقوف، تمام حیوانات، نباتات، جمادات، سیارے، ستارے، زمین، آسمان سبھی خدا ہوئے۔ اس کے بعد ایمان و کفر کی حقیقت ختم ہو گئی۔ جب ہر انسان خدا ہی کے وجود کا حصہ ہے تو پھر آخرت کی جزا و سزا کیا معنی رکھتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر صوفیاء نے انا الحق یعنی ''میں حق ہوں'' اور سبحانی ما اعظم شانی یعنی ''میں پاک ہوں، میری شان کیا بلند ہے'' کے نعرے لگائے۔ وحدت الوجود کو بڑے پیمانے پر ہندوؤں کے ہاں اختیار کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے ہاں ہر چیز کو دیوی دیوتا کا مقام دے دیا گیا ہے۔

اسلام اور مروجہ صوفی ازم میں دوسرا بڑا فرق ''ختم نبوت'' کا عقیدہ ہے۔ قرآن مجید کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ پر نہ صرف نبوت ختم ہوئی بلکہ نبوت کے دروازے کو مکمل طور پر بند کر کے اسے سیل کر دیا گیا۔ صوفی علماء بظاہر تو ختم نبوت کے قائل نظر آتے ہیں مگر یہ انبیاء کرام کی وحی کے علاوہ بھی خدا سے براہ راست ہدایت حاصل کرنے کے قائل ہیں۔ اس طریق کار کو ''الہام'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وحی اور الہام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ محض لفظی اختلاف ہے ورنہ دونوں کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست ہدایت حاصل کی جائے۔

اگر خدا سے براہ راست ہدایت حاصل کرنے کو ممکن تصور کر لیا جائے تو پھر وحی اور نبوت کی

کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔اس کے بعد کوئی شخص اگر نبوت کا دعوی نہ بھی کرے، وہ الہام کی بنیاد پر ہی دوسروں کو اپنی اطاعت کے لئے مجبور کرسکتا ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ اس الہام کے قائل ہمارے بزرگ بڑی شدت سے ختم نبوت کے عقیدے کا پرچار کرتے ہیں اور جھوٹے نبیوں کے پیروکاروں کے خلاف مہم چلاتے ہیں۔مگر ایسا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ الہام کو درست تصور کر کے خود ہی ختم نبوت کے عقیدے پر ضرب بھی لگا رہے ہوتے ہیں۔ان حضرات کے ہاں یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کی نظیر شاید ہی کسی اور معاملے میں مل سکے۔

قرآن مجید اور مروجہ تصوف کی دعوت میں تیسرا بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن بار بار انسان کی عقل کو اپیل کرتا ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کو ایک عقل مند مخلوق بنایا ہے۔یہ عقل ہی وہ شرف ہے جس کی بدولت انسان حیوانات سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔عقل اور وحی میں کوئی تضاد نہیں بلکہ انسانی عقل اگر جذبات سے مغلوب نہ ہوئی ہو تو پھر یہ وحی کی آواز کو پہچانتی اور اس کی طرف لپکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار ''کیا تم عقل نہیں رکھتے؟'' اور ''تاکہ تم عقل سے کام لو'' کہہ کر انسانی عقل کو اپیل کی جاتی ہے۔قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ اس کی نشانیوں میں اہل عقل ہی غور وفکر کرتے ہیں۔

اس کے بالکل برعکس ان اہل تصوف کی اکثریت کے ہاں عقل کو ''حجاب اکبر'' قرار دیا جاتا ہے۔ان کی محفلوں میں اپنی عقل سے سوچنے والوں کی بری طرح حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ مریدین کو اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ خود کو مرشد کے سپرد اس طریقے سے کریں جیسے زندہ کے ہاتھ میں مردہ ہوتا ہے۔ برصغیر کے ایک بڑے صوفی عالم لکھتے ہیں:

بیعت ارادت یہ ہے کہ مرید اپنے ارادہ و اختیار ختم کر کے خود کو شیخ و مرشد ہادی برحق کے بالکل سپرد کر دے، اسے مطلقا اپنا حاکم و متصرف جانے، اس کے چلانے پر راہ سلوک چلے، کوئی

قدم بغیر اس کی مرضی کے نہ رکھے۔ اس کے لئے مرشد کے بعض احکام، یا اپنی ذات میں خود اس کے کچھ کام، اگر اس کے نزدیک صحیح نہ بھی معلوم ہوں تو انہیں افعال خضر علیہ الصلوۃ والسلام کی مثل سمجھے، اپنی عقل کا قصور جانے، اس کی کسی بات پر دل میں اعتراض نہ لائے، اپنی ہر مشکل اس پر پیش کرے۔۔۔

مرشد کے حقوق مرید پر شمار سے افزوں ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہو کر رہے۔ اس کی رضا کو اللہ عزوجل کی رضا اور اس کی ناخوشی کو اللہ عزوجل کی ناخوشی جانے۔ اسے اپنے حق میں تمام اولیائے زمانہ سے بہتر سمجھے، اگر کوئی نعمت دوسرے سے ملے تو بھی اسے (اپنے) مرشد ہی کی عطا اور انہیں کی نظر کی توجہ کا صدقہ جانے۔ مال، اولاد، جان سب ان پر تصدق (وار دینے) کرنے کو تیار رہے۔

ان کی جو بات اپنی نظر میں خلاف شرعی بلکہ معاذ اللہ (گناہ) کبیرہ معلوم ہو، اس پر بھی نہ اعتراض کرے، نہ دل میں بدگمانی کو جگہ دے بلکہ یقین جانے کہ میری سمجھ کی غلطی ہے۔۔۔ جو وہ حکم دیں ''کیوں'' نہ کہے، دیر نہ کرے، سب کاموں میں اسے تقدیم (اولیت) دے۔۔۔

ان تعلیمات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مرید، اپنے پیر کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ مرید کی مکمل برین واشنگ کر کے اسے پیر و مرشد کا ذہنی و نفسیاتی غلام بنا دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے جو طریق ہائے کار استعمال کیے جاتے ہیں، ان کی تفصیل ہم اپنی کتاب ''مسلم دنیا اور ذہنی، فکری اور نفسیاتی غلامی'' میں بیان کر چکے ہیں۔

پروین سلطانہ حنا

غزل

جو سوزِ قلب سے نکلیں وہ آہیں چن لی ہیں
کہ تیرا قرب جو بخشیں وہ راہیں چن لی ہیں

ہر ایک درد کا درماں ہے ذاتِ پاک تیری
میرے یقین نے تیری پناہیں چن لی ہیں

ہے سچ کہ خار بہت ہیں وفا کے رستے میں
ہم اہلِ درد نے ایسی ہی راہیں چن لی ہیں

قدم قدم پہ یہاں بے شمار منظر ہیں
گناہ سے باز رکھیں، وہ نگاہیں چن لی ہیں

جہاں پہ معبدِ برحق کی ہی پرستش ہو
سو دِل نے ایسی ہی کچھ خانقاہیں چن لی ہیں

وہ چل پڑی ہے گزر گاہِ معرفت کی طرف
حنا نے جب سے محبت کی راہیں چن لی ہیں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ
اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجئے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھئے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجئے......یا
ایک پے آرڈر/بینک ڈرافٹ بنام ''ماہنامہ انذار'' بینک الفلاح المحد ود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوائیے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

ابو یحییٰ کا نیا ناول

آخری جنگ

- ☆ جب زندگی شروع ہوگی کی کہانی کا دلچسپ تسلسل
- ☆ شیطان اور انسان کی ازلی جنگ کا آخری معرکہ
- ☆ شیطانی طاقتوں کے طریقہ واردات کا دلچسپ بیان
- ☆ شیطان کے حملوں کو ناکام بنانے کے موثر طریقے
- ☆ مسلمانوں کے عروج کا وہ راستہ جو قرآن مجید بتاتا ہے
- ☆ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی کا حقیقی راستہ
- ☆ تاریخ کے وہ اسباق جو مسلمان بھول چکے ہیں
- ☆ یہ سب کچھ عبداللہ اور ناعمہ کی داستان کی شکل میں پڑھیے

قیمت 350 روپے

رسالے کے قارئین کے لیے خصوصی رعایت

Monthly
INZAAR

JAN 2019
Vol. 07, No. 01
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi